ایک دکھ بھری کہانی

مصنف: اقبال برکی

مصور: فخر الدین

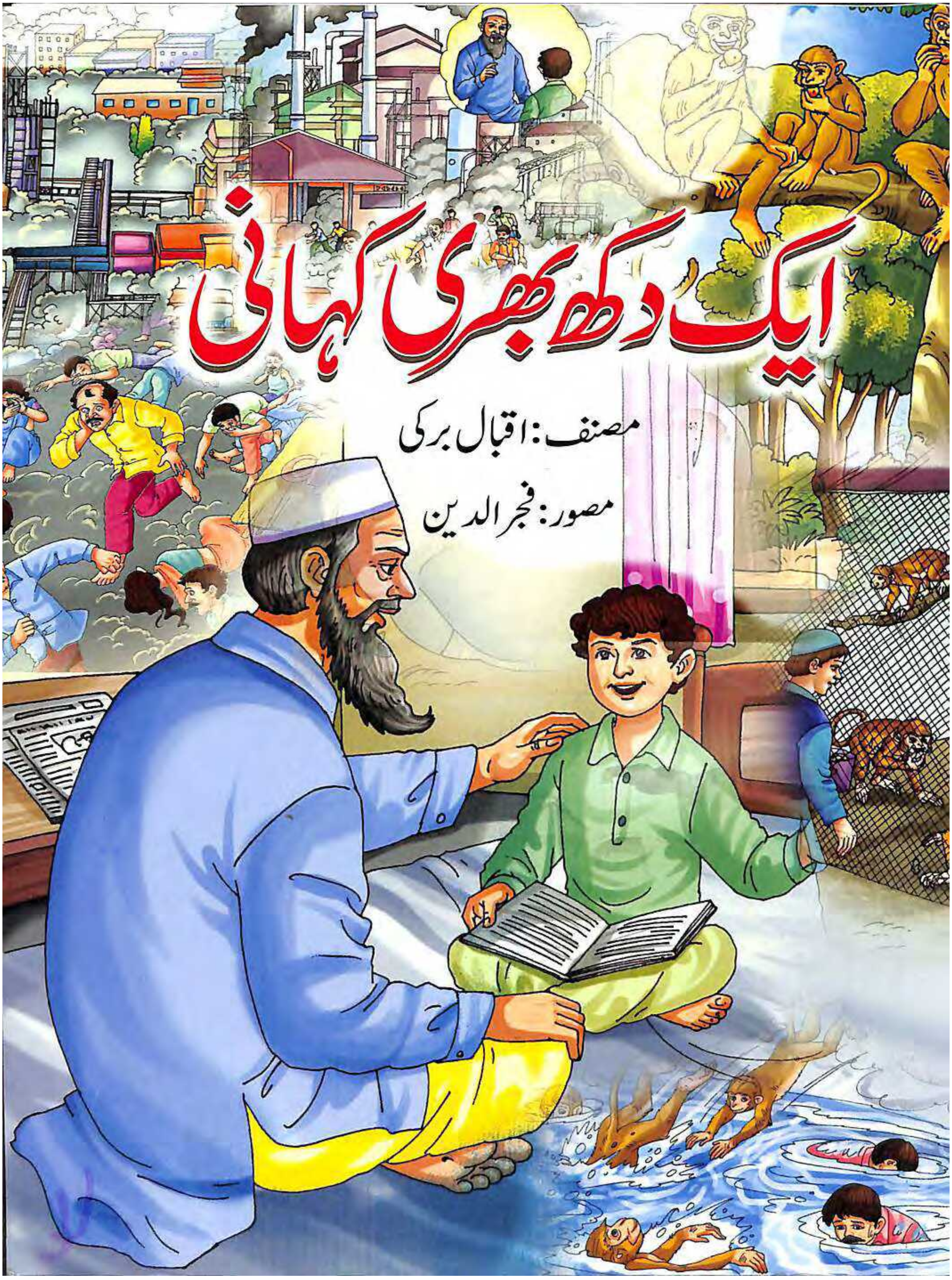

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2016
تعداد : 2000
قیمت : -/25روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1914

EK DUKH BHARI KAHANI

By: Eqbal Barki

ISBN:978-93-5160-155-5

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی، 110025
فون نمبر:49539000 فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک 8، آر کے پورم، نئی دہلی، 110066 فون نمبر:26109746 فیکس:26108159
ای میل:urducouncil@gmail.com ای میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسارا امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ، انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035
اس کتاب کی چھپائی میں 130GSM, Art Paper استعمال کیا گیا ہے۔

”اچھا تو سنو!“ تازہ اخبار کو اپنے بیڈ سے لگے رائٹنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

”لیکن آج آپ کو ”ایک ایسا واقعہ سنائیں گے جس کے متعلق آپ کو بھی غور کرنا ہے، اُس کے متعلق سوچنا ہے .... سمجھے!“ میں نے کہا۔

اُس نے صرف ایک بار اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور میرے بیڈ پر اچھی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہوا بولا، ”اب جلدی سے بولونا ....“

میرے بیٹے کی جیسے ایک عادت سی بن گئی تھی ۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب بھی مجھے اخبار الٹتے پلٹتے دیکھتا دوڑتے ہوئے میرے پلنگ پر چڑھ جاتا اور کچھ دیر بعد فرمائش کرتا، ''ابو کوئی اچھا سا واقعہ سناؤنا...........''

میں واقعہ سنانا شروع کرتا کبھی تاریخی، کبھی سچے واقعات سناتا، کبھی کسی کہانی کے کوئی دلچسپ حصے کو واقعہ بنا کر سنا دیتا یا کبھی کبھی کوئی من گھڑت ایسا واقعہ سنا دیتا جس سے کچھ عبرت کا کوئی سبق سیکھنے کا پہلو نکلتا ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ میں واقعہ سنانا شروع کرتا۔ کچھ دور پہنچتا اور پھر مجھے اپنے بیٹے کی تیز سانسوں کا ایک مترنم شور سنائی دینے لگتا۔

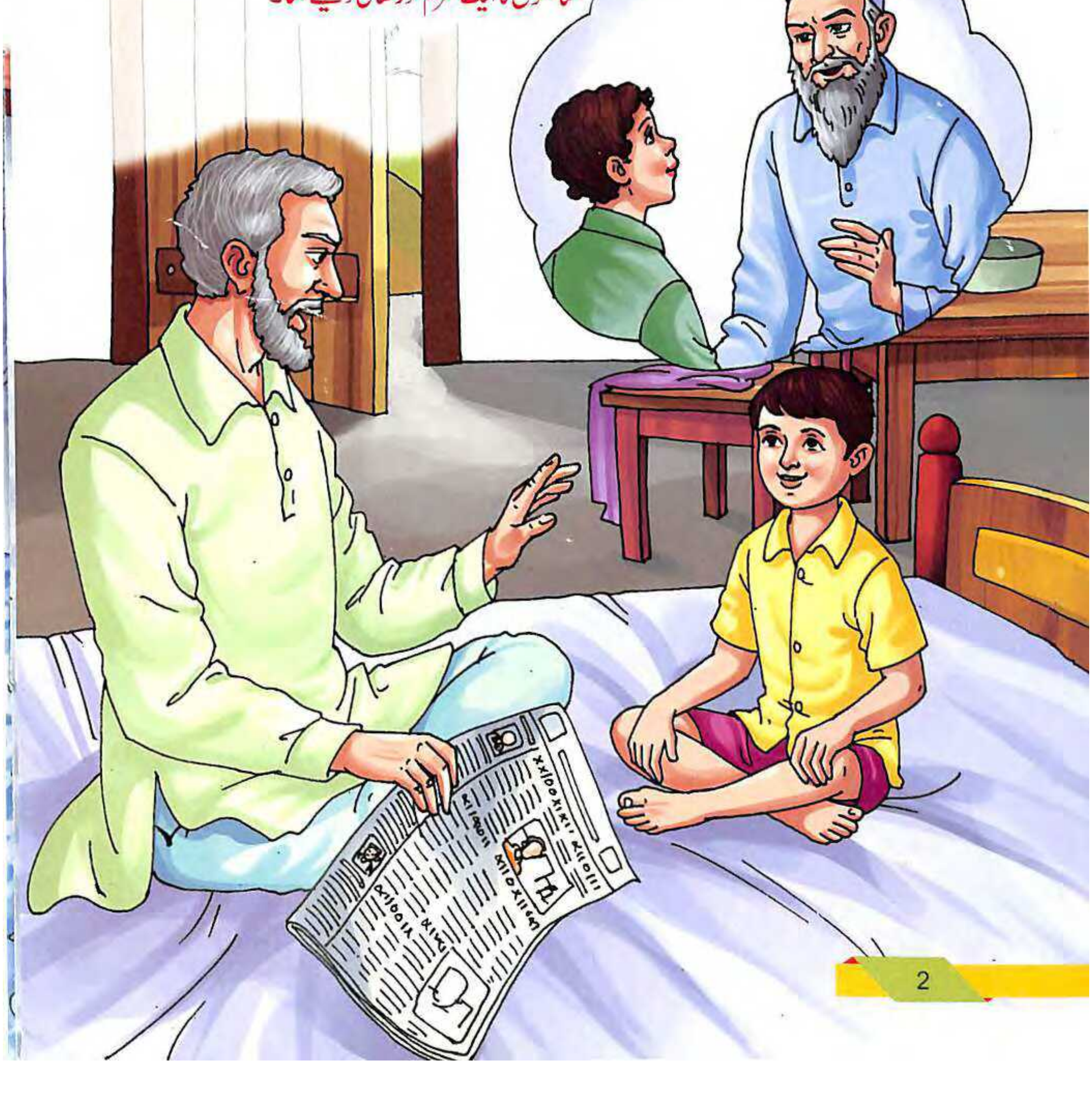

جب میں اُسے دیکھتا تو وہ گہری نیند میں ڈوب چکا ہوتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ کوئی واقعہ پورا سن سکا ہو۔ اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو وہ پورا واقعہ سن لیتا لیکن جب میں یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ اُس کو کتنا سمجھا ہے اور اُس سے کوئی سوال کرتا تو ایسا ہوتا کہ وہ الٹا مجھ سے ایک سوال کر بیٹھتا اُس کا سوال سن کر میں یہ تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ اس واقعے یا کہانی کے کون سے حصے پر اٹکا رہا اور اس کا ذہن وہیں سے میرا ساتھ چھوڑ کر نہ جانے کن کن وادیوں میں بھٹکتا رہا تھا۔ اسی لیے آج میں نے اس سے کہا تھا کہ اس واقعے پر تم کو بھی غور کرنا ہے۔

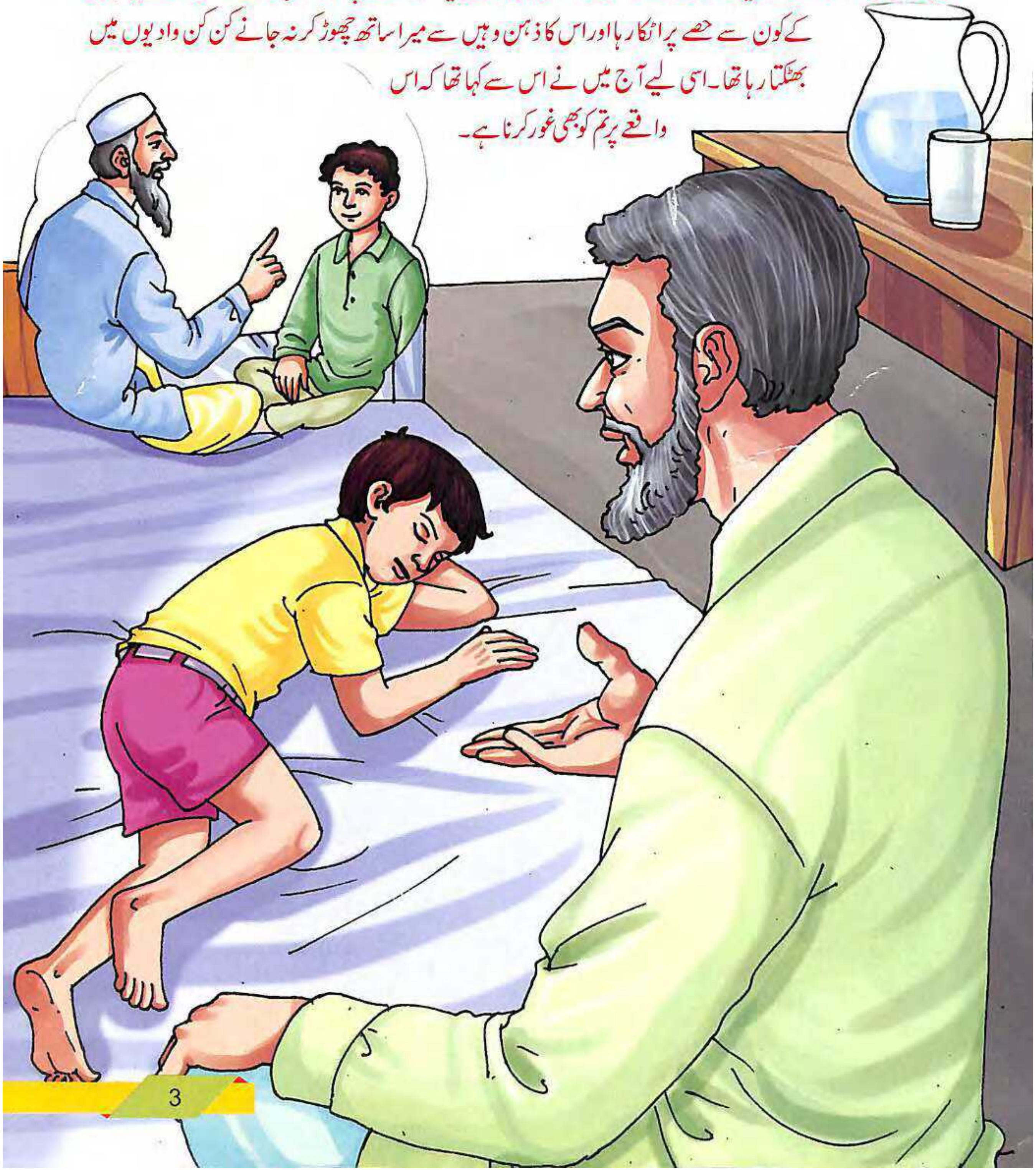

وہ ہمہ تن گوش تھا اِس کی پلکیں بہت دیر بعد جھپکتی تھیں۔

میں نے کہنا شروع کیا۔

’’آج سے تقریباً تیس برس پہلے ہمارے ملک میں ایک بھیانک حادثہ ہوا تھا۔ ایک ایسا حادثہ کہ اگر دنیا کے کسی اور ملک میں ہوتا تو صدیوں تک بھلایا نہیں جاتا اور اس کا جتنی زیادہ سختی سے نوٹس لیا جاتا، اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔‘‘

’’کیسا حادثہ ہوا تھا............ ابو جی!‘‘

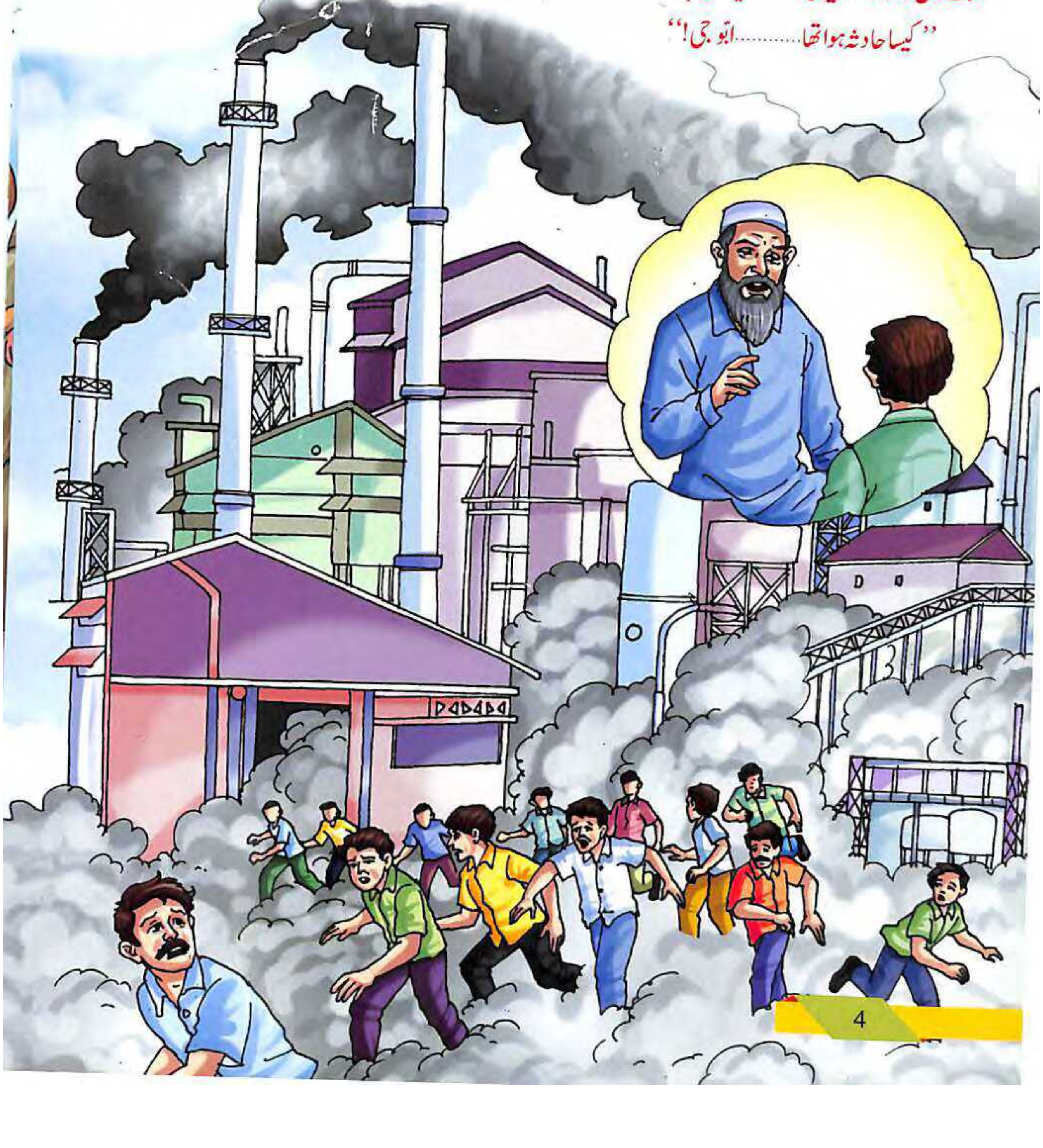

''بھیانک!......بہت بھیانک!!......ایک ایسا حادثہ کہ صرف ایک گھنٹے میں ہزاروں لوگ موت کے منہ میں چلے گئے تھے..''

''ابو! اچھی طرح بولونا......'' میری الجھی ہوئی اور جذباتی بات کو کاٹتے ہوئے اس نے مجھے ٹوکا۔

میں اس حادثہ کو سیدھی اور اپنے بیٹے کی سمجھ میں آجانے والی زبان میں دہرانے لگا۔

'' آپ جانتے ہو ہمارے پڑوس کی ایک ریاست مدھیہ پردیش بھی ہے...... بولو تو ذرا مدھیہ پردیش کی راجدھانی کیا ہے؟''

''وہ......وہ......وہ بھوپال......بھوپال ہے ناابّو جی......بھوپال......!''

بالکل......بالکل ٹھیک......آپ کی یہ معلومات اچھی ہے۔شاباش بیٹا......

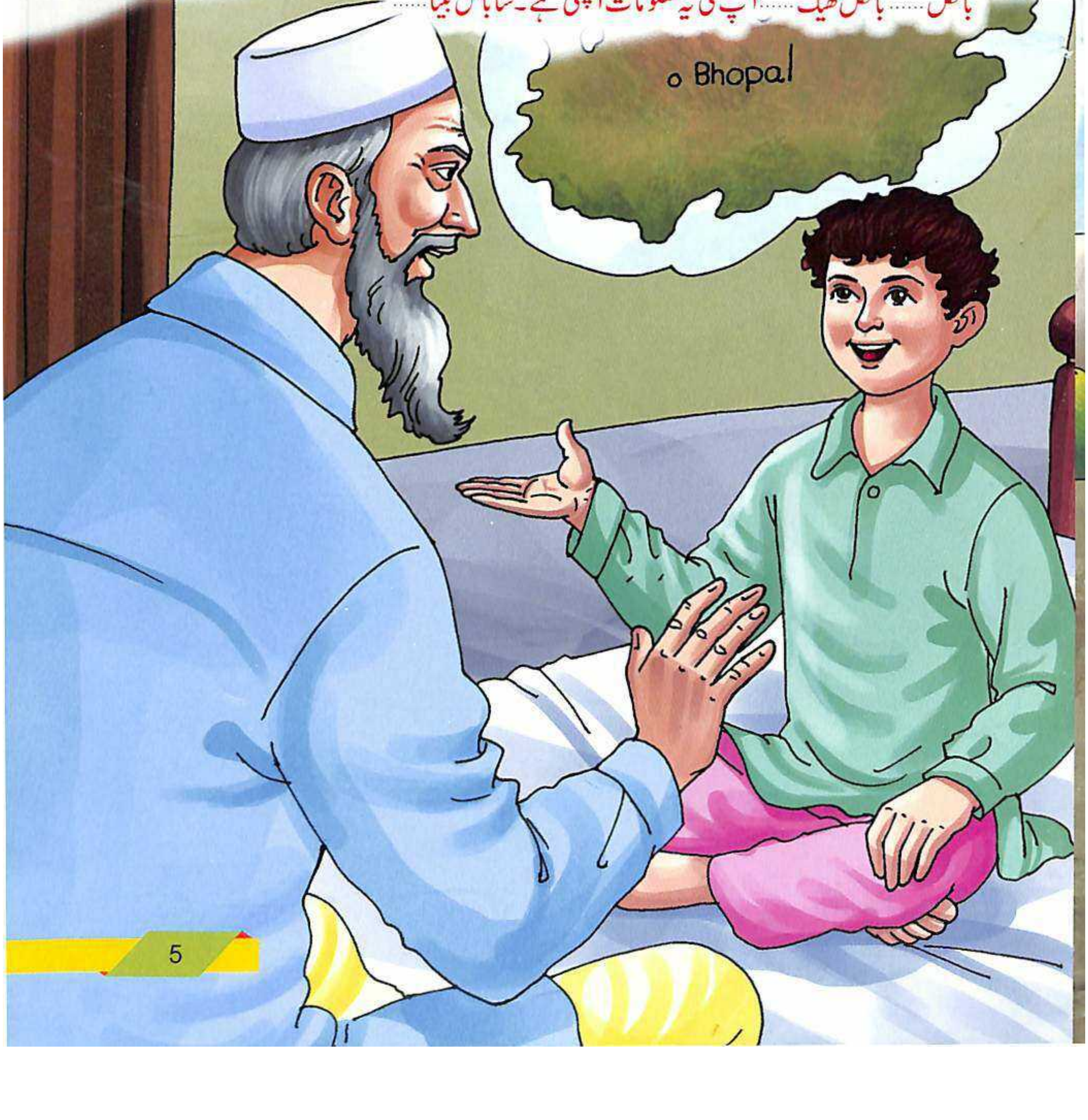

ہاں تو وہاں پر ایک بہت بڑی فیکٹری تھی.......... آپ جانتے ہیں.......... یہ ہمارے سامنے دیوار پر جو گھڑی لگی ہے.......... ذرا بتاؤ تو یہ کیسے چلتی ہے؟''

''ابّو وہ تو سیل سے چلتی ہے.......... چھوٹے پینسل سیل سے!'' اس نے برجستہ کہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے دوبارہ رٹ لگائی، ''ابو واقعہ سناؤ نا۔''

''ارے بیٹا وہی تو سنا رہا ہوں.......... ہاں ٹھیک ہے یہ اپنی گھڑی سیل سے چلتی ہے.......... ٹارچ بھی تو سیل سے چلتی ہے۔ لیکن شاید آپ کو نہیں معلوم کہ یہ سیل کہاں اور کیسے بنتا ہے.......... ہوں تو بھوپال کی اُس بڑی سی فیکٹری میں یہی سیل بنائے جاتے تھے۔ طرح طرح کے سیل! چھوٹے بڑے، گول چوکور، ہلکے بھاری، چپٹے، باریک اور ہر قسم کے۔ لیکن ان کے بنانے کا طریقہ آسان نہیں ہے ۔ مختلف مشینوں کے مختلف کل پرزے ان پر عمل کرتے ہیں۔

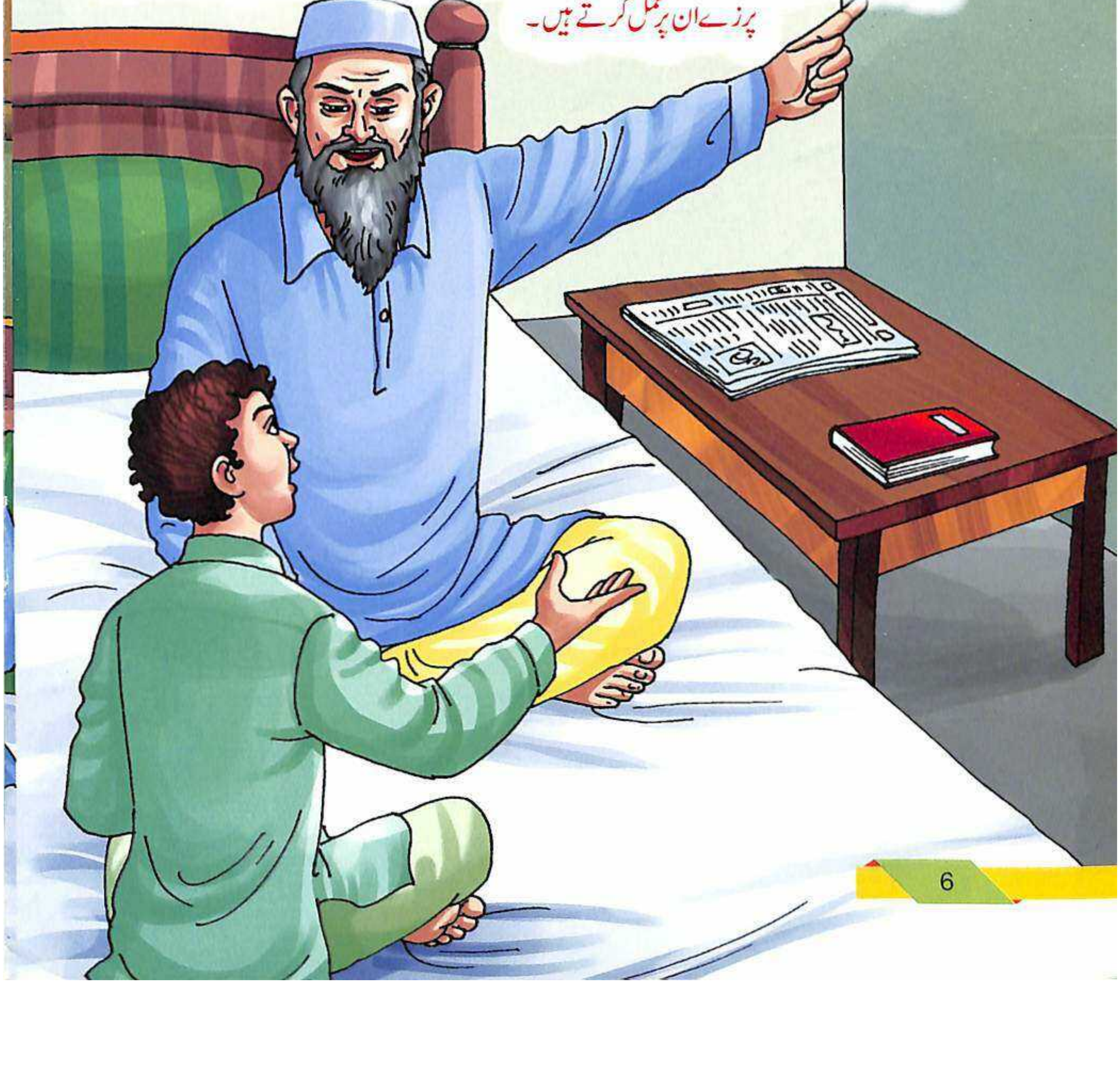

اس کے علاوہ مختلف قسم کے سامان اور کچھ مسالے بھی لگتے ہیں۔ان سب کو ایک ساتھ ملا کر ٹین کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے۔ پھر اس مسالے میں ایک قسم کی گیس بھی ملائی جاتی ہے .... لیکن اتنی احتیاط اور ایسی مشینوں کے ذریعے ملاتے ہیں کہ وہ گیس نہ تو اپنے سلینڈر سے اور نہ ہی کسی نلکی سے باہر آتی ہے، اور نہ ہی اُسے کسی طرح باہر نکلنے دیا جاتا ہے۔ ٹین کا یہی خول جس میں مختلف مسالے اور یہ گیس ملائی جاتی ہے مشین ہی کے ذریعے دوبارہ بڑی احتیاط سے بند کردیے جاتے ہیں۔"

"ہاں تو پھر .... آپ واقعہ سناؤ نا .... سیل مت بتاؤ ...." وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا۔"

"ارے بابا وہی سنانے جا رہا ہوں۔ ذرا صبر بھی کرو .... ہاں تو پھر ....

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ گیس جس سلینڈر میں رکھی جاتی تھی اور سلینڈر سے جو نلکی لگی ہوئی تھی، وہ کہیں سے لیک ہوگئی۔ جیسی ہمارے کچن میں ہے۔

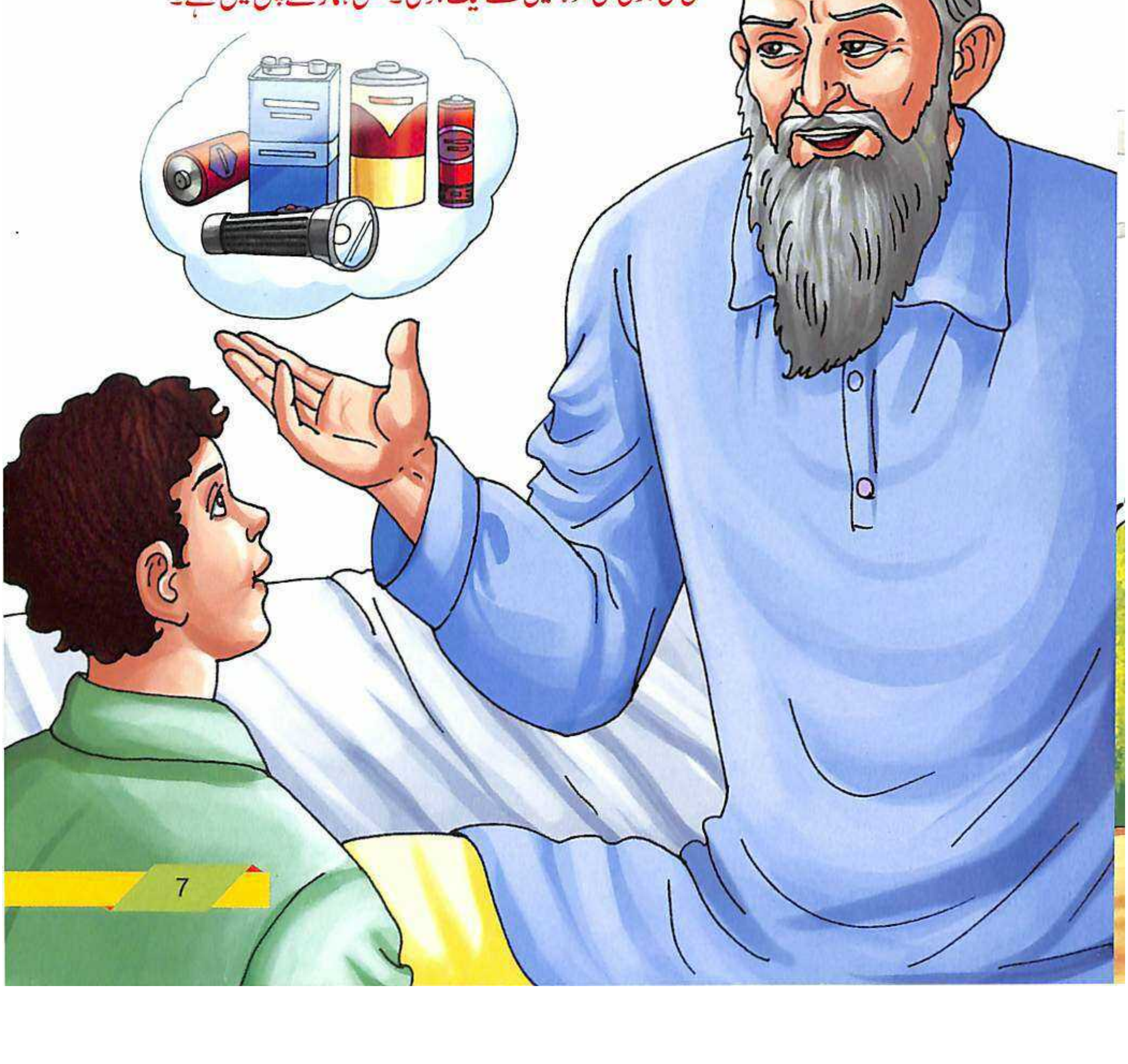

جب کچن کی گیس لیک ہوتی ہے تو آپ لوگ کیسے جلدی سے شور مچاتے ہو کیونکہ اس میں ایک قسم کی بو ہوتی ہے۔
بالکل اسی طرح اس فیکٹری سے بھی گیس لیک ہوگئی لیکن آپ کو حیرت ہوگی اس گیس میں کوئی بو نہیں تھی۔
وہ نلکی سے نکلی اور تیزی سے فیکٹری کے اندر اور باہر پھیلتی چلی گئی۔ جیسے ہی وہ گیس بستی میں پھیلی تباہی مچادی۔

جب وہ گیس لوگوں کی ناک سے ہوتے ہوئے ان کے گلے تک اور گلے سے نیچے ان کے سینوں میں پہنچی تو ان کی سانسوں کی نالیوں اور ان کے پھیپھڑوں کو فوراً خراب کر دیا۔ لوگ تڑپ تڑپ کر فوراً مر گئے۔

اس طرح دیکھتے دیکھتے اس بستی کے ہزاروں لوگ جو رات کو سو رہے تھے سوتے سوتے موت کی نیند سو گئے۔ لیکن جو لوگ جاگ رہے تھے یا تکلیف۔ کی وجہ سے جاگ گئے تھے، اپنی آنکھوں، حلق اور سینوں میں شدید جلن محسوس کر رہے تھے۔ ایسی جلن کہ وہ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کچھ لوگ تو اسی بھاگ دوڑ میں مر گئے لیکن کچھ لوگ اسی بھاگ دَوڑ کی وجہ سے بچ بھی گئے۔''

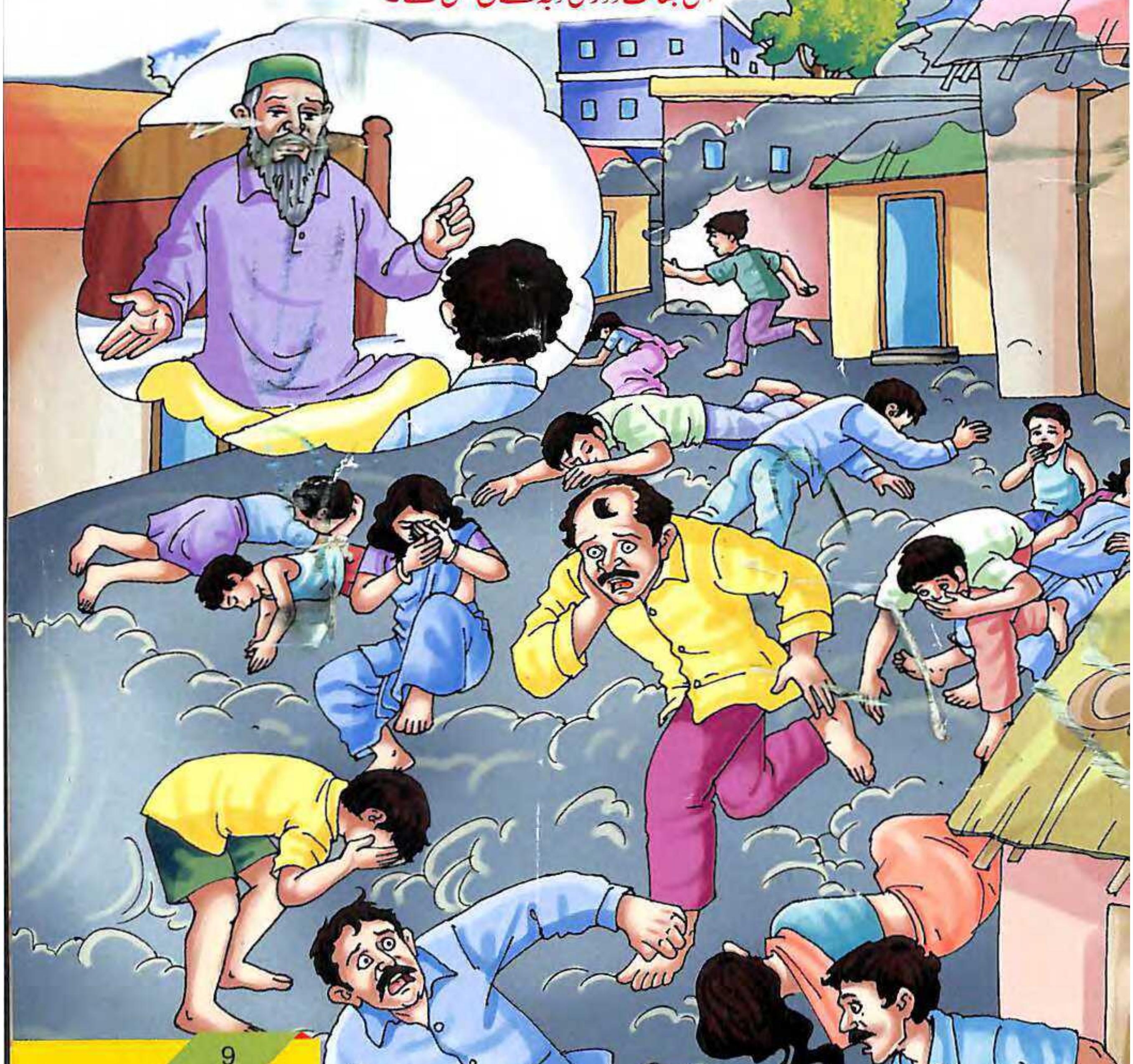

''وہ کیسے ابو جی؟'' میرے خاموش ہوتے ہی وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''وہ اس طرح بیٹا............ کہ............ دیکھو پہلے کے بوڑھے تجربہ کار لوگ اکثر کہتے تھے کہ اگر کبھی کسی جنگل میں جانا ہو اور کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہو تو کوئی فکر و پریشانی کی بات نہیں۔ جنگل میں بندروں کو تلاش کرو۔ جنگل میں بندر ہوں تو سمجھو کھانے پینے کا انتظام ہو گیا۔''

''تو کیا ہم بندروں کو کھائیں گے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''نہیں بیٹا۔ بندر کیسے کھائیں گے؟ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم بندر پر نظر رکھیں۔ ہم یہ دیکھیں کہ جنگل میں وہ کون سا پھل کھاتے ہیں۔ ہم بھی وہی پھل کھائیں۔ ہو سکتا ہے وہ پھل کھٹا کسیلا یا پھر ذائقہ میں مزے دار نہ ہو۔ لیکن کم از کم ہمارا پیٹ بھر تو جائے گا۔ ہم بھوکے تو نہیں رہیں گے۔ اُن بڑے بوڑھوں نے آخر ایسی نصیحتیں کیوں کی تھیں؟ جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟''

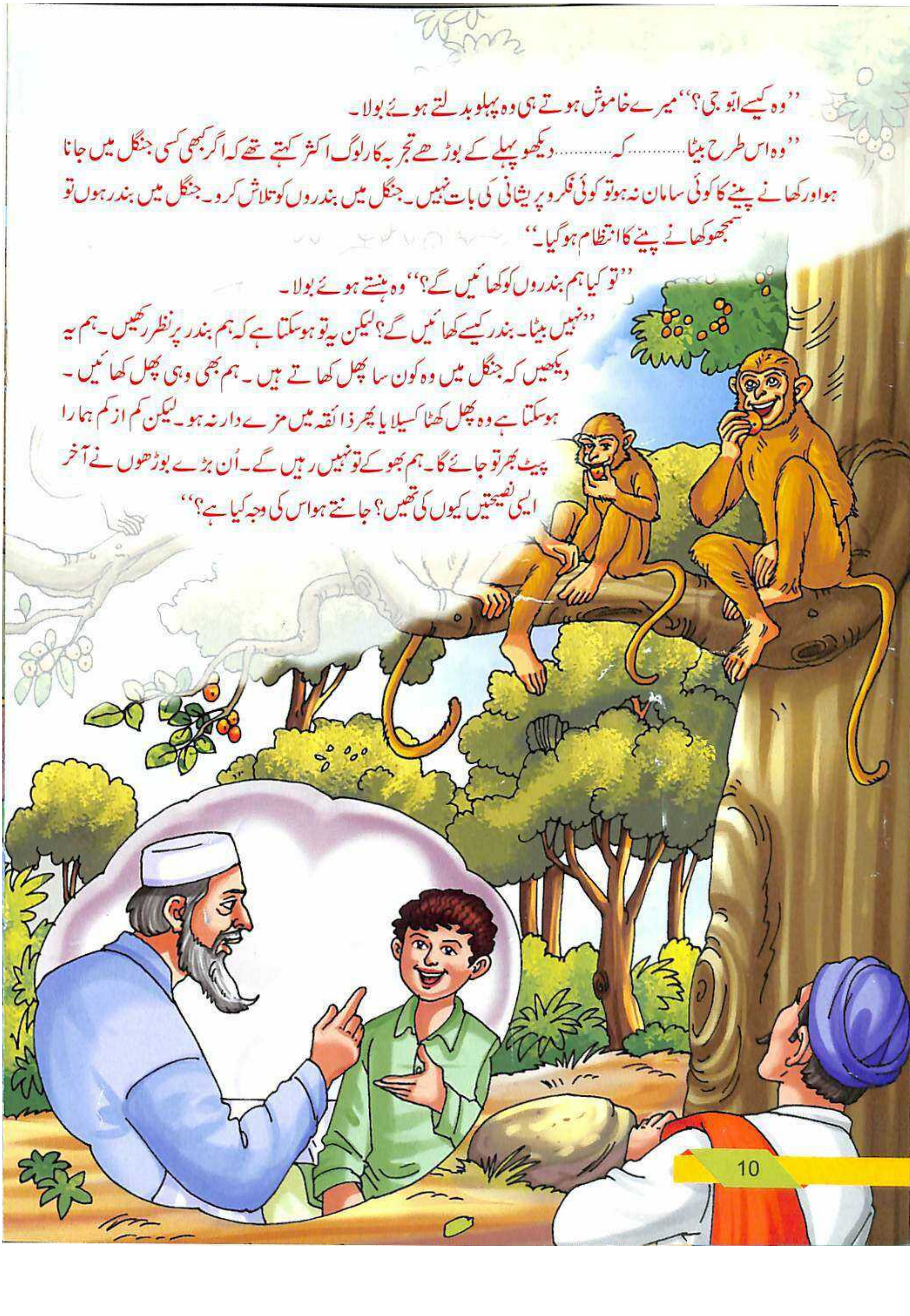

''نہیں............ میں نہیں جانتا!'' کہنے سے پہلے ہی اُس نے نفی میں زور زور سے اپنا سر ہلانا شروع کر دیا تھا۔

''تو سنو! سنو بیٹا! اس لیے کہ بندر ایک ایسا جانور ہے جو کبھی کوئی ایسی چیز نہیں کھاتا جس پر اُسے نقصان کا خوف ہو۔ وہ اپنی غذا اور اپنے کھانے پینے کے معاملے میں بہت محتاط ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بندر کھانے سے پہلے کسی بھی چیز کو بار بار سونگھتے ہیں۔ اُسے خوب الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ اچھی طرح اطمینان کر لیتے ہیں تب کہیں جا کر منہ لگاتے ہیں۔''

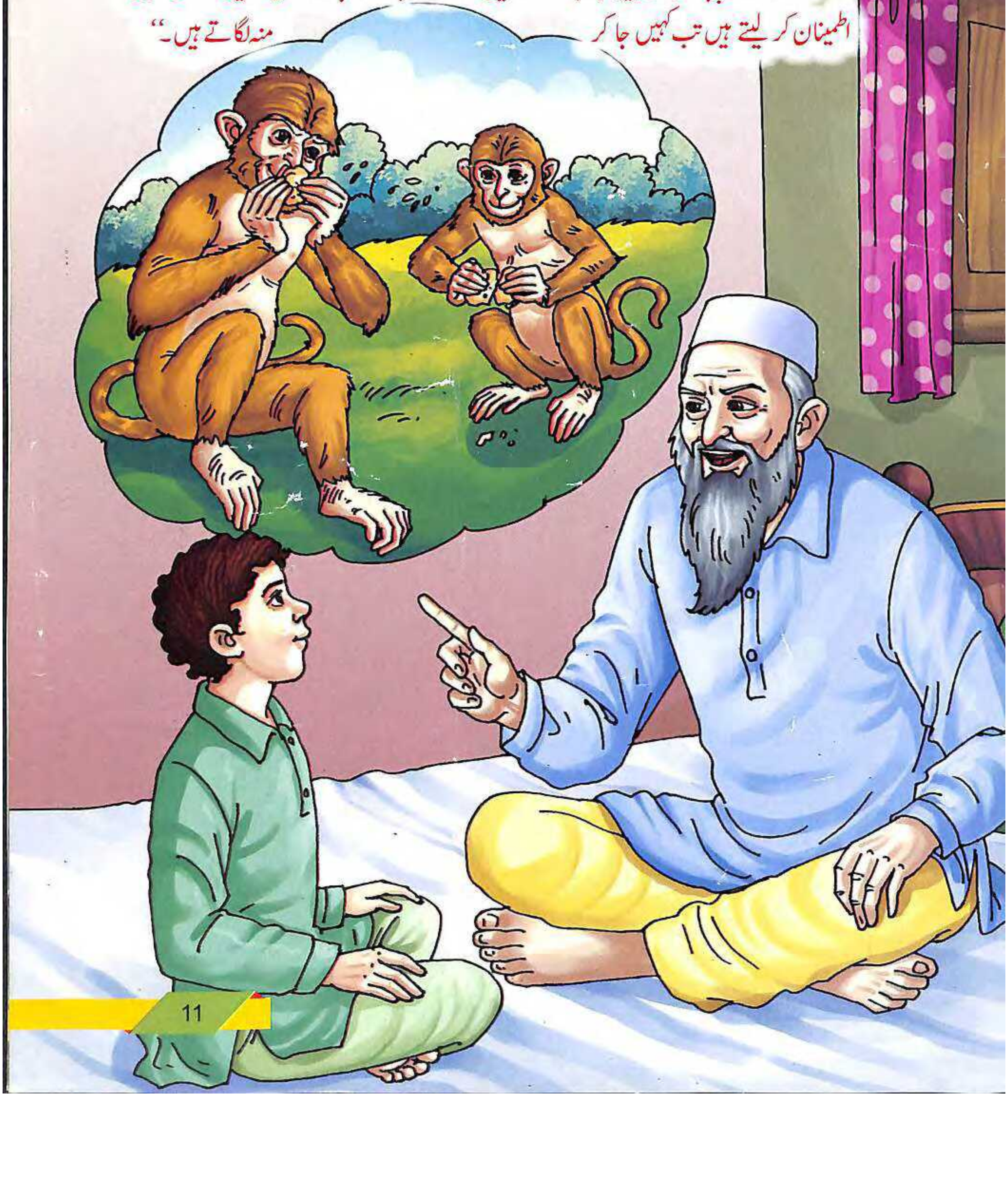

''ابّو .... ہاں .... ہاں .... بالکل .... اورنگ آباد کے چڑیا گھر کے بندر کے پنجرے میں جب رؤف بھیّا نے مونگ پھلیاں پھینکی تھی تو بندر انھیں اٹھا کر بار بار سونگھتے تھے ۔ کئی کئی بار سونگھنے کے بعد انھوں نے مونگ پھلیاں کھائی تھیں ۔''

اس نے جلدی سے اپنا ایک مشاہدہ بیان کر دیا۔

''ہاں .... ہاں ٹھیک .... بالکل .... بالکل ٹھیک .... تو بالکل اسی طرح وہاں بھوپال میں سیل بنانے والی اس فیکٹری کے آس پاس کی بستی اور اس سے لگی پہاڑیوں پر بہت سے بندر بھی رہتے تھے۔ جیسے ہی وہ گیس ان کی ناک اور نتھنوں سے حلق تک پہنچی تو انھیں بھی اپنے حلق میں جلن اور گھٹن کا احساس ہوا۔

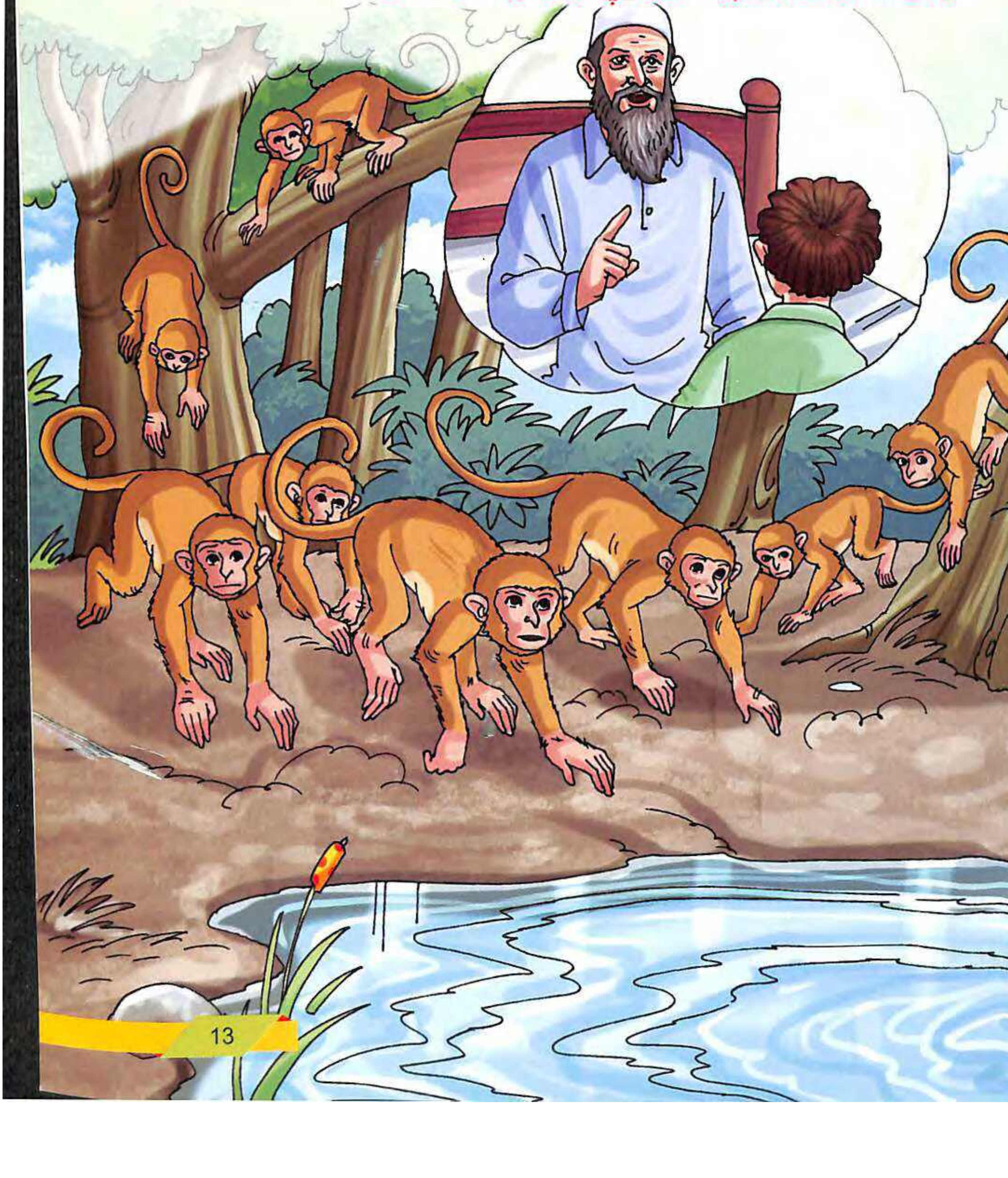

جانتے ہوان بندروں نے کیا کیا؟ وہ گھبرا کر ادھر ادھر نہیں بھاگے بلکہ وہ جہاں تھے وہاں سے سیدھے ان تالابوں کی طرف بھاگے جو بھوپال شہر میں ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں بھوپال شہر میں بڑے بڑے تالاب ہیں؟''

''نہیں۔ مجھے نہیں معلوم!'' اس نے بڑی معصومیت سے انکار کر دیا۔

'' کیوں بھئی؟ .... کیا آپ بھول گئے جب آپ کے عارف بھیّا دہلی کی سیر سے واپس آئے تھے تو آپ کو سناتے تھے کہ........... تال تو تال بھوپال تال باقی سب تلیاّ........... اور رانی سورانی روپ متی باقی سب کنہیا۔''

''ہاں ہاں عارف بھیّا کے ساتھ ہم سب دہراتے تھے۔''

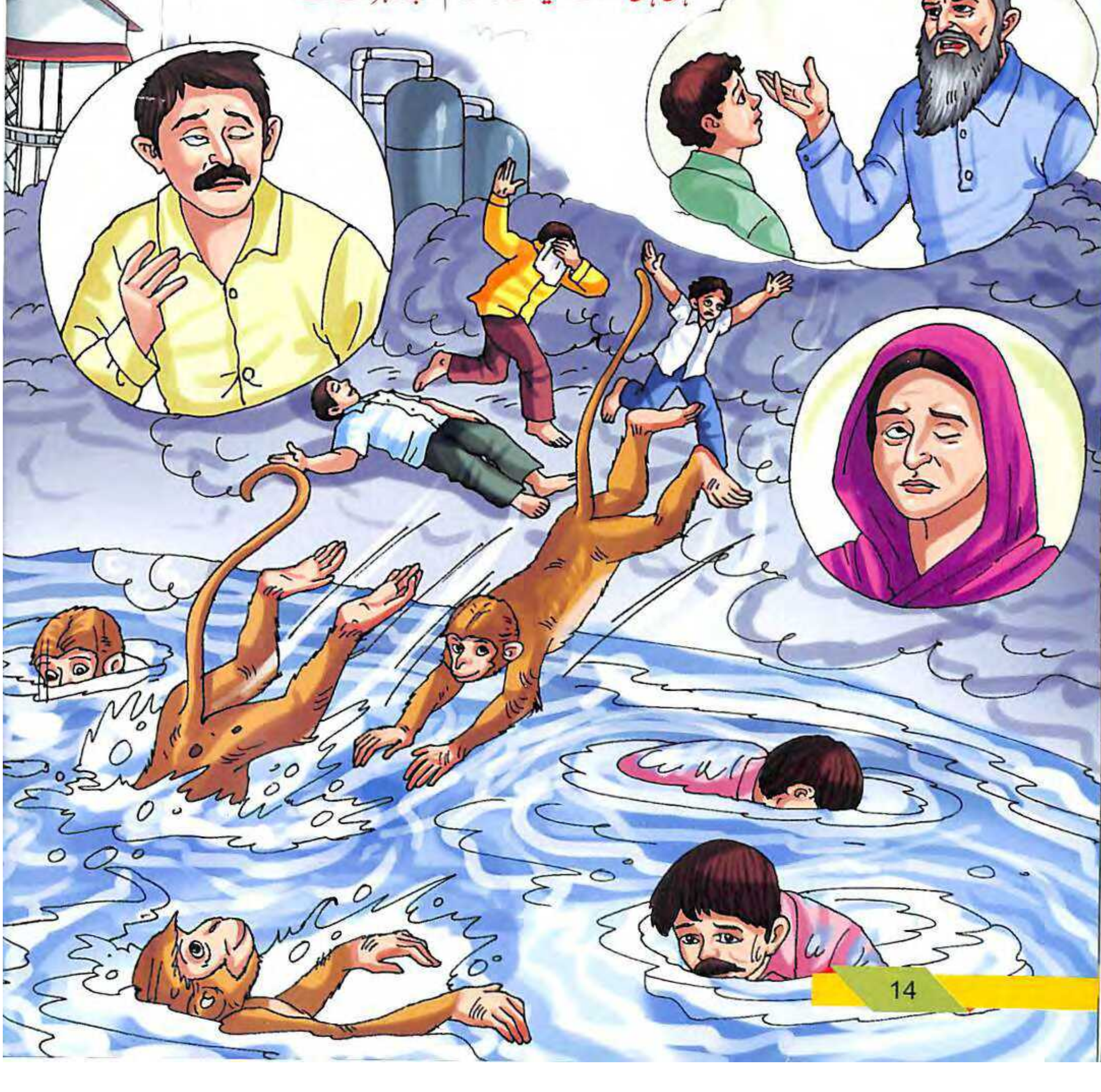

''ہاں ...... بالکل وہی ...... یاد آیا تا ...... تو تال ہندی لفظ ہے۔ ہندی میں تالاب کو تال کہتے ہیں ...... تو وہ بندر ......'' میں نے دوبارہ واقعہ کی طرف اُسے کھینچا'' جانتے ہو وہ بندر تالاب کی طرف کیوں بھاگے تھے؟''

نفی میں اُس کی صرف گردن ہلی تھی۔ منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا تھا۔

''ہاں تو وہ بندر تالاب کی طرف بھاگے اور فوراً اس میں ڈبکی لگانے لگے ...... اور میاں آپ کو حیرت ہوگی ...... اس طرح شاید ہی کوئی بندر اس گیس سے مرا ہو ...... ان بندروں کو دیکھ کر جن لوگوں نے تالاب میں چھلانگ لگا دی تھی یا پھر جن لوگوں نے رومال کو پانی میں تر کر کے اپنے چہرے پر رکھ لیا وہ بھی بچ گئے تھے۔ لیکن جو لوگ ایسا نہیں کر سکے وہ یا تو مر گئے یا پھر ہمیشہ کے لیے گونگے بہرے ہو گئے یا پھر ان بے چاروں کی دنیا ہی اندھیری ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لیے اندھے ہو گئے کیونکہ اس گیس سے ان کی آنکھیں بھی خراب ہو گئی تھیں۔ یہ ہمارے ملک کا ایک ایسا دلدوز حادثہ ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگ موت کی نیند سو گئے۔''

''مگر ابو ...... وہ جو لوگ تالاب میں کود گئے تھے وہ کیسے بچ گئے تھے؟''

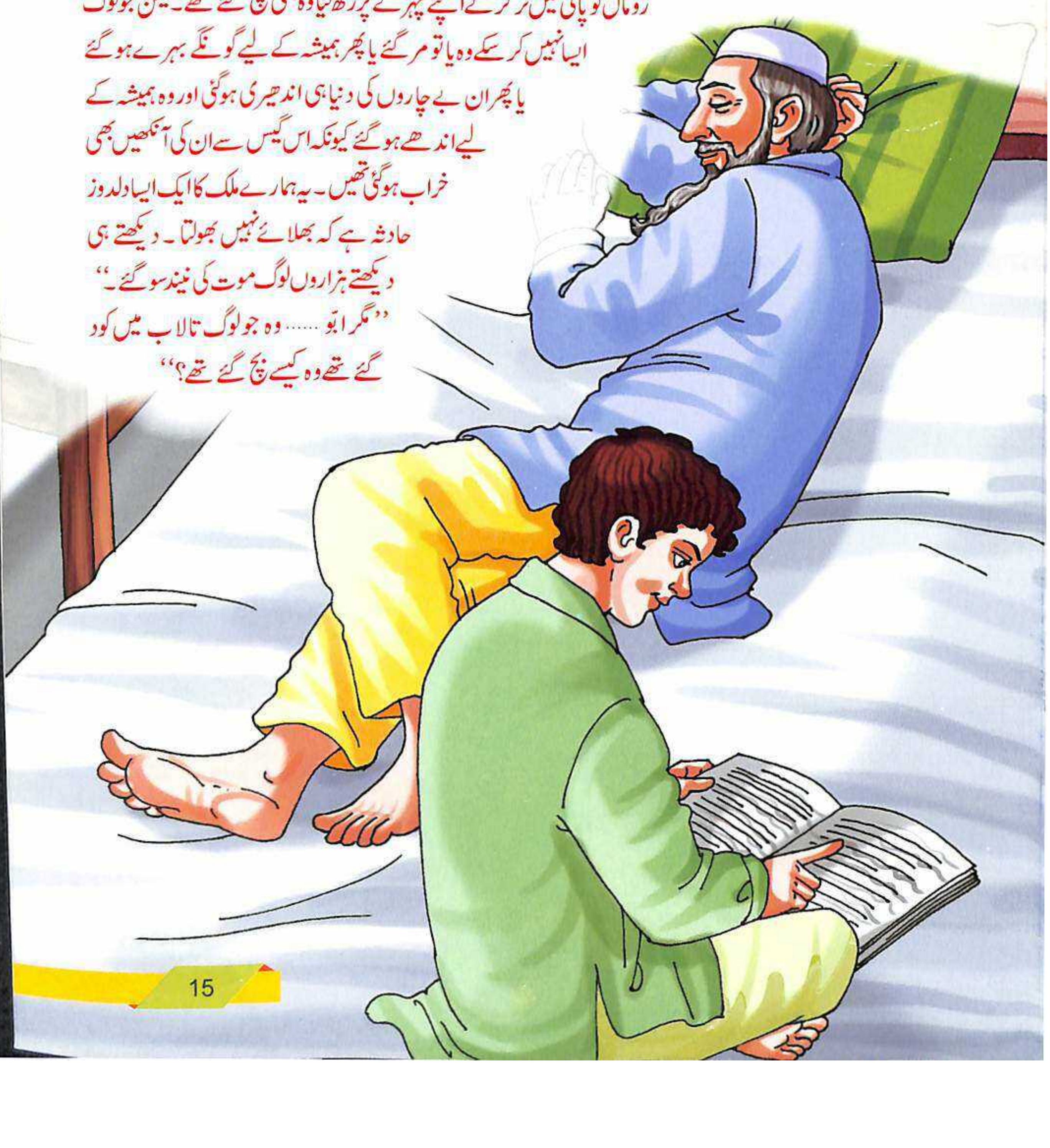

''ہاں ...... اب آپ نے بالکل صحیح سوال کیا ہے ...... یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں نہیں مرے ...... اب اس سوال کا جواب خود سوچو ...... خوب غور کرو ...... اگر آج نہیں تو کل ...... پرسوں ...... بلکہ ہفتہ بھر کے بعد بھی اگر آپ کو جواب معلوم ہو جائے تو مجھے بتا دینا ...... ٹھیک ہے ...... اچھا۔ مجھے تھوڑا سا لیٹنے دو ......'' کہتے کہتے میں نے کروٹ بدل لی۔

اور جب عصر سے کچھ پہلے بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرا بیٹا وہیں بیٹھا ہے۔ لیکن اب اس کے ہاتھ میں اس کی سائنس کی کتاب تھی اور وہ ایک مخصوص جگہ پر انگلی دبائے کتاب کو پکڑے ہوئے تھا۔ وہ جیسے میرے بیدار ہونے ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا، بولا، ''ابّو جی ...... اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ گیسیں پانی میں حل پذیر ہوتی ہیں ...... پانی میں ڈوب کر نکلنے والے بندروں کے آس پاس کی گیس ان کے جسم پر بہنے والے پانی میں حل ہو گئی تھی کیونکہ وہ بھی پانی میں حل پذیر تھی۔ اس طرح ان کو صاف ہوا مل گئی اور وہ لوگ بچ گئے ......''

''بالکل ...... بالکل یہی بات ہے۔ ویری گڈ ...... ویری نائس مائے بوائے! جواب تو آپ نے بہت جلدی ڈھونڈ نکالا! ویری گڈ ......''

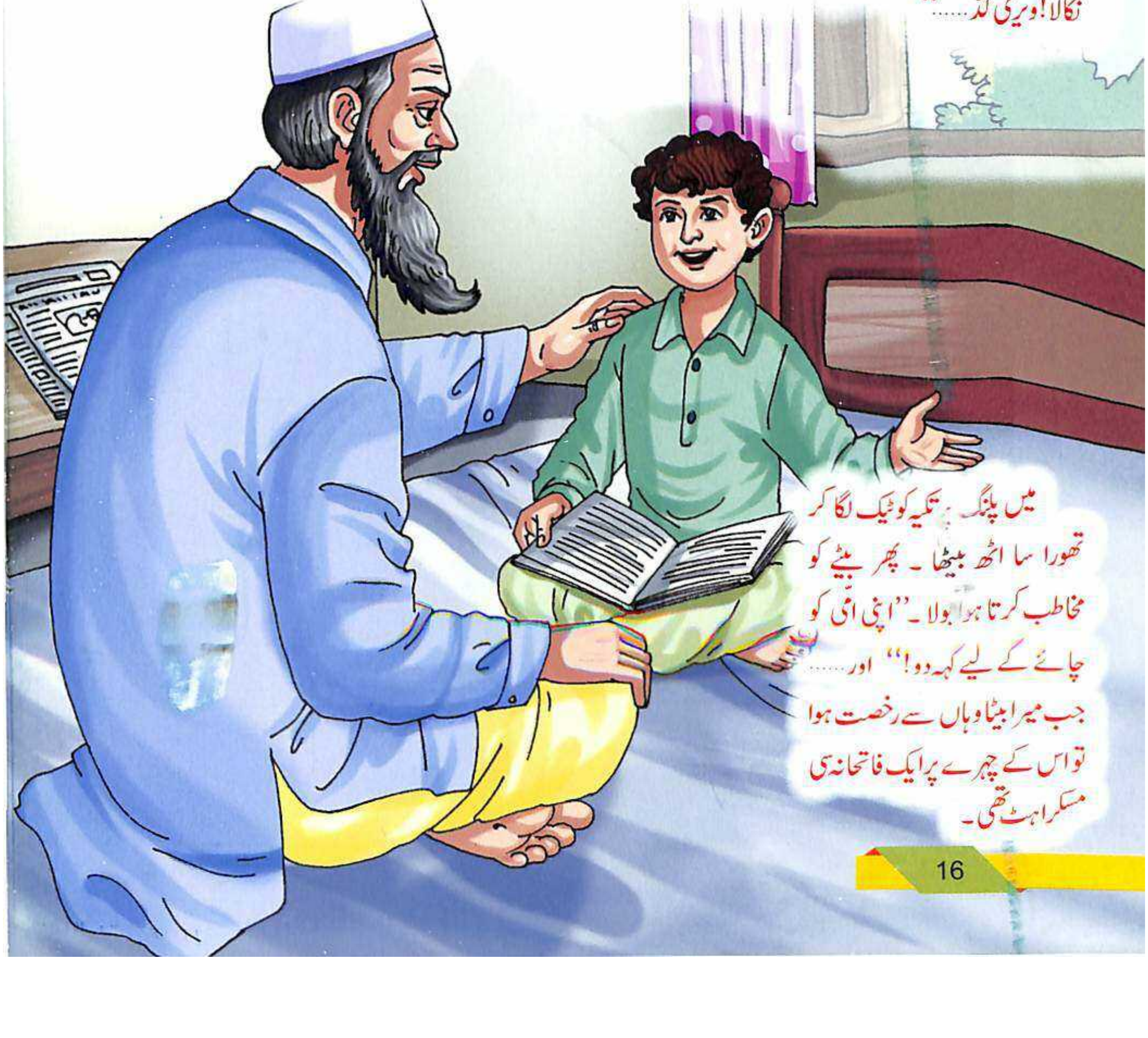

میں پلنگ پر تکیہ کو ٹیک لگا کر تھورا سا اٹھ بیٹھا۔ پھر بیٹے کو مخاطب کرتا ہوا بولا۔ ''اپنی امّی کو چائے کے لیے کہہ دو!'' اور ...... جب میرا بیٹا وہاں سے رخصت ہوا تو اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔

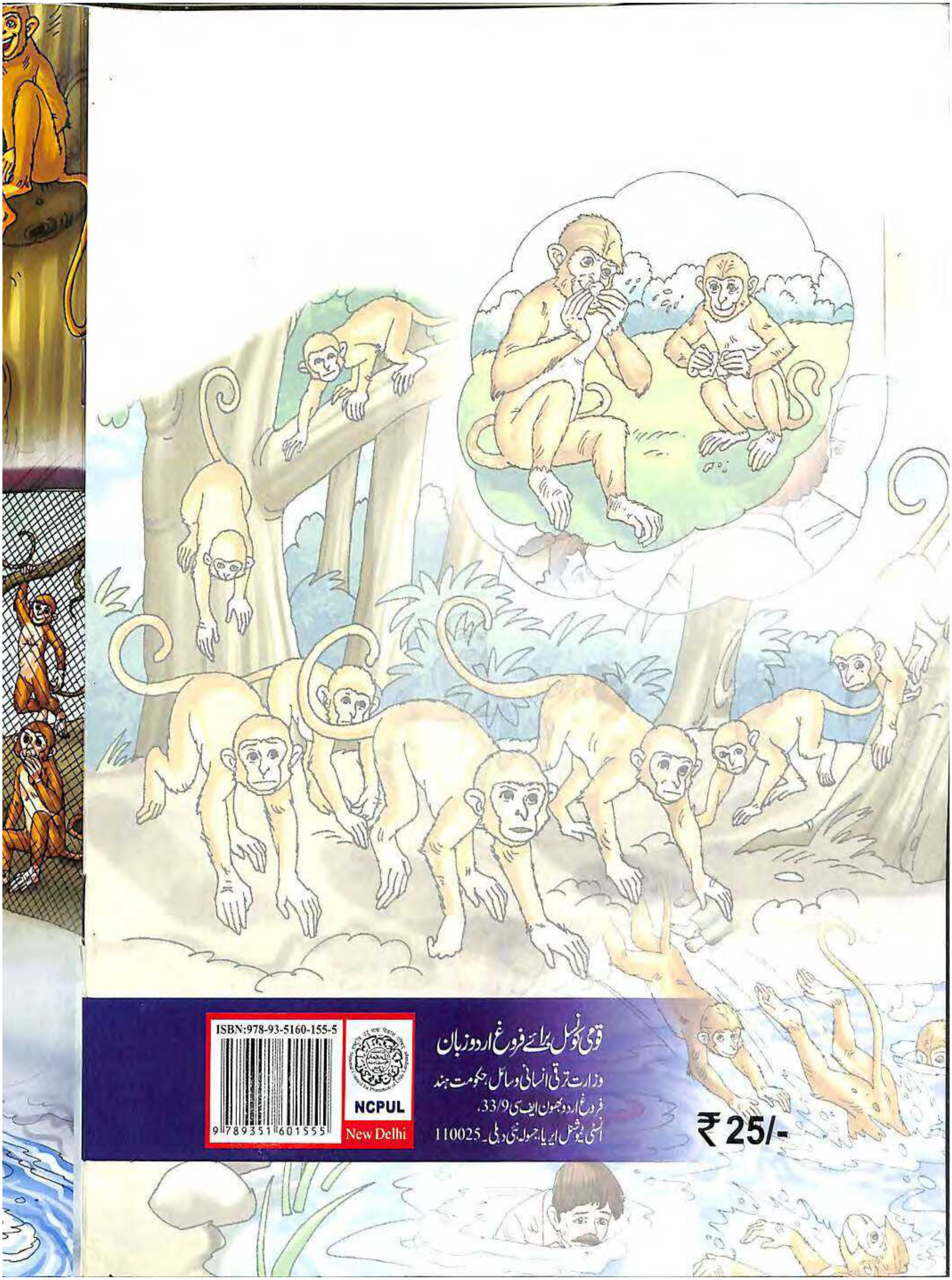

ISBN:978-93-5160-155-5
NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

₹ 25/-